

۱۳ اواں ذا کر حسین یادگاری خطبہ

اکبرالہ آبادی :

نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

شمس الرحمن فاروقی

۱۲ فروری ۲۰۰۳ء

ذا کر حسین کالج

(دہلی یونیورسٹی)

جو اہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی

۲۱ او اس ذا کر حسین یادگاری خطبہ

اکبرالہ آبادی :

نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

شمس الرحمن فاروقی

۱۲ فروری ۲۰۰۳ء

ذا کر حسین کالج

(دہلی یونیورسٹی)

جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

۲۳ اوال ذا کر حسین یادگاری خطبہ

اکبر الہ آبادی :

نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

شمس الرحمن فاروقی

صدر: سراج حسین

شیخ الجامعہ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

ناشر: سلمان غنی ہاشمی

پرنپل، ذا کر حسین کالج
(دہلی یونیورسٹی)

جوہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تعارف

گذشتہ کئی برسوں سے ذاکر حسین میموریل لکھنؤہ مارے کالج کی علمی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے خطبے کے لئے پروفیسر مس ا الرحمن فاروقی کو دعوت دی گئی۔ پروفیسر فاروقی علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پچھلی چار دہائیوں میں شعرو ادب، تنقید، لسانی اور تہذیبی تاریخ اور دیگر اصناف میں ان کی تخلیقات سنگ میل کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔

اپنے خطبے ”اکبرالہ آبادی : نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے اقدار“ میں فاروقی صاحب نے تاریخی و تہذیبی پس منظر میں اکبرالہ آبادی کی نظریاتی شاعری کے اجزاء کو پرکھا ہے اور ان کے طنز و مزاح کے پچھے چھپے ہوئے کرب کی عکاسی کی ہے۔ ذاکر حسین کالج برادری اپنی علمی کاوشوں میں پروفیسر فاروقی کی شمولیت کو ایک اعزاز تصور کرتی ہے۔

سلمان ہاشمی

ذاکر حسین کالج
نئی دہلی

پیش لفظ

سب سے پہلے تو ذاکر حسین کا لج کے پرنسپل، اور کانج کے دوسرے ارباب حل و عقد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے مجھے چودھواں ذاکر حسین یادگاری خطیب مقرر کیا۔ عرفان حبیب، رومیلا تھاپڑ، سومنا تھر چڑھی، نامور سنگھ، اور ان کی طرح کے دوسرے علماء اور دانشوروں کی مخالف میں میرا بھی نام آئے، یہ میرے لئے افتخار کی بات ہے۔ امید ہے کہ آج کی یہ میری گفتگو کسی نہ کسی حد تک اس معیار کو برقرار رکھے گی جو میرے ان ممتاز پیش روؤں نے قائم کیا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ ذاکر صاحب کے نام کے ساتھ کسی کا نام متعلق ہو، بالواسطہ ہی سکی، تو وہ بھی بجائے خود تو قیر کی بات ہے۔ میں چونکہ رسمی طور پر علی گڑھ سے کبھی منسلک نہیں رہا، اس لئے ذاکر صاحب کو قریب سے دیکھنے کی سعادت مجھے نہ حاصل ہوئی۔ لیکن جس طرح ایک طرف مہاتما گاندھی، ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو، کے نام ہم لوگوں کے لئے، جو ۱۹۴۰ کی دہائی میں پیدا ہوئے، اور جو ہماری جدوجہد آزادی کی گہما گہمی اور پرشور نعروں کے درمیان پلے ہیں، بالکل گھریلو نام تھے، تو اسی طرح دوسری طرف علامہ اقبال، حضرت مولانا، اور ذاکر صاحب کے بھی نام ہم لوگوں کے لئے گھریلو افراد کے ناموں کی حیثیت رکھتے تھے۔ مجھے اپنے دل و دماغ کی سنسنی اور وہ اہتزاز اب بھی اچھی طرح یاد ہیں، جب نو عمری میں مجھے رشید صاحب کی مختصر کتاب ”ذاکر صاحب“ پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ میرے خیال میں

رشید صاحب کی شائستہ، نفس طبائی، حاضر جوابی اور ان کی تاب ناک نثر سے بڑھ کر اگر کوئی چیز ممکن تھی تو وہ خود ذا کر صاحب ہی کی ذات تھی جیسی کہ وہ رشید صاحب کے ان اور اق میں جلوہ گرتھی۔

قوم پرستانہ نظریات میں، علم کی وسعت میں، مزاج کی نفاست میں، ذا کر صاحب ہندو مسلم کردار و مزاج کی بہترین خصوصیات کا مثالی نمونہ تھے۔ اور اکبر اللہ آبادی بھی اسی ہندو مسلم تہذیب کے مثالی نمونہ تھے، اگرچہ وہ اپنے انداز کے ہی ایک شخص تھے۔ اس لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذا کر صاحب کی یادگار میں ایک خطے کا موضوع اکبر اللہ آبادی کو بنایا جائے، بالخصوص ایسے وقت میں جب روشن فکری اور غیر متعصب نامہ ہبیت پرمی ہماری بہت کی روایات اور اقدار ہماری موجودہ تہذیب کے دو متضاد دھاروں کے نرغے میں ہیں۔ ایک طرف تو ہم محیط الارضی (Globalization) کے نام پر مغربی طرز فکر و حیات کی اندھی اور غیر تنقیدی تقلید کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف ہم پوری کوشش میں کہ قو اپرتو کے نام پر سارے ملک میں تعلیم، ثقافت، اور سیاست کی دنیا میں نوفاشی (Neo-fascistic) میزانیاتی (Totalizing) تصورات جاری کر دئے جائیں۔ اس باعث مجھے امید ہے کہ میرا یہ مضمون ان دو عظیم ہندوستانیوں کو محض خراج عقیدت کے سوا کچھ اور بھی ہو گا۔

شمس الرحمن فاروقی

فروری ۲۰۰۲ء

اکبرالہ آبادی : نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

ہم میں سے اکثر کو اکبرالہ آبادی کی زندگی کے اہم حالات سے واقفیت ہے، لہذا میں یہاں صرف مختصر ا ان کا اعادہ کروں گا۔ سید اکبر حسین کی پیدائش ۱۸۳۶ء میں الہ آباد کے پاس جنما پار کے بارہ نامی گاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والد سید تفضل حسین سے حاصل کی۔ ان لوگوں کا خاندان بارہ کے علاقے میں مدت سے آباد تھا۔ قدامت پسند، متوسط الحال، اور عزت نفس کے پاس دار اس خاندان نے قدیم کلاسیکی تعلیم کی روایتوں کو برقرار رکھا تھا، لیکن ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اکبر کو مجبوراً ۱۸۶۳ء میں جمنا پر زیر تعمیر پل کے ٹھیکے دار کے یہاں گلر کی ملازمت کرنی پڑی۔ اس درمیان انہوں نے اپنی کوششوں سے انگریزی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی اور ۱۸۷۷ء میں عدالت ضلع کے وکلاء کا امتحان بآسانی پاس کر لیا۔ انہیں ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیل دار مقرر کیا گیا، لیکن جلد ہی انہوں نے وہ نوکری ترک کر دی اور ہائی کورٹ کے وکلاء کا امتحان پاس کر کے الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔ چند برس کی وکالت کے بعد ۱۸۸۰ء میں وہ منصف کے عہدے پر فائز کئے گئے۔

اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت اور عہدوں میں مسلسل ترقی کرتے ہوئے ۱۸۹۳ء میں شنجی پر تعینات ہوئے۔ جلد ہی وہ بنارس میں، اور پھر دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ نجج کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ حکومت انگلشیہ نے انہیں ۱۸۹۸ء میں خطاب خان بہادری سے سرفراز کیا۔ ملازمت سے سبک دوشی (۱۹۰۳) کے بعد وہ کوتواں الہ آباد کے چھپے اپنی تعمیر کردہ وسیع کوٹھی ”عشرت منزل“ میں آرام اور نیم خانہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے، اگرچہ اس زمانے میں

انہیں آنکھوں کی تکلیف کے علاوہ اور بھی عارضے لاحق ہوئے، لیکن بحثیت مجموعی ان کے وظیفہ یابی کے دن اچھے گزرے۔

زندگی کے آخری برسوں میں مہاتما گاندھی، ملک کی آزادی، اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے مہاتما گاندھی کی جدوجہد سے اکبر کا شغف پہلے سے بھی فزوں ہو گیا۔ انہوں نے ان موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار ایک طویل نظم (یا مختصر نظموں کے طویل سلسلے) "گاندھی نامہ" میں کیا۔ اکبر نے ۱۹۲۱ میں اس دنیا سے کوچ کیا۔ اس وقت وہ ملک کے ادبی منظر نامے پر ایک نہایت قوتمند اور سیاسی سماجی اعتبار سے وابستہ شاعر کی حیثیت سے اپنی شہرت کے باام عروج پر تھے۔

گذشتہ پانچ دہائیوں میں اکبر کے ساتھ شعر و ادب کے میدان میں کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اپنی زندگی میں تو ان کی توقیر بے حد اور ان کی شہرت غیر معمولی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دو، اور بیسویں صدی کی اول دو دہائیوں میں ان کے دوستوں اور مدافوں کی فہرست تو اس وقت کا Who's Who in India معلوم ہوتی ہے! اس بات کے باوجود کہ اکبر کا سر سید کے خیالات اور گوشوارہ عمل سے سخت اختلاف تھا، خود سر سید کے دل میں اکبر کا حب و احترام اس قدر تھا کہ انہوں نے اکبر کو علی گڑھ تعینات کرالیا تاکہ ان کی صحبت کا جی بھر لطف اٹھائیں۔ اقبال نے اکبر کے ایک شعر کے بارے میں ان کو لکھا کہ آپ نے اس شعر میں ہیگل کا پورا فلسفہ بیان کیا ہے، بلکہ "ہیگل کے سمندر کو ایک قطرے میں بند کر دیا ہے۔"

مدن موہن مالوی نے اکبر الہ آبادی سے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر نظموں میں لکھوا میں۔

اکبر کی وفات کے بعد بھی ان کا کلام ایک دو دہائیوں تک مقبول رہا۔ ان کا کلمیات تین

جلدوں میں ۱۹۰۹ سے ۱۹۲۱ کے درمیان چھپا تھا۔ اکبر کے زمانہ حیات میں، اور ان کے بعد بھی یہ جلدیں کئی بار چھپیں۔ پہلی جلد تو ۱۹۳۶ تک گیارہ بار چھپ چکی تھی۔ دوسری نے ۱۹۳۱ تک سات اور تیسرا نے ۱۹۳۰ تک پانچ اشاعتیں دیکھیں۔ لیکن آج معاملہ بالکل مختلف ہے۔

”گاندھی نامہ“ (۱۹۲۱-۱۹۱۹) صرف ایک بار ۱۹۲۸ میں چھپی، اور مدت سے نایاب ہے۔ خود کلیات کی تیسرا جلد کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی تھی اور وہ اکبر کی وفات سے بمشکل چند ہفتے قبل اگست ۱۹۲۱ میں منظر عام پر آسکی تھی۔ (ممکن ہے ان تعلیقتوں میں اکبر کے بیٹے اور ان کے کلام کے مختار عام عشرت حسین کی بھی ست مزاجی کو دخل رہا ہو)۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، عشرت حسین نے کلیات اکبر کی چوتھی جلد کو شائع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا، اور نہ ”گاندھی نامہ“ کی اشاعت پر انہوں نے توجہ کی۔ اکبر الہ آبادی کے پوتے محمد مسلم رضوی نے ”گاندھی نامہ“ کو ۱۹۲۸ میں کتابستان، الہ آباد سے چھپوا�ا۔ اکبر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام قمر الدین احمد بدایونی کی کتاب ”بزم اکبر“ (۱۹۲۰) میں مل جاتا ہے۔ یہ کتاب بھی اب کیا ہے۔ سرور تونسوی مرحوم نے مکتبہ شان ہند سے اکبر کا ایک کلیات شائع کیا تھا۔ اس میں کلیات کی چوتھی جلد کا بھی کچھ کلام شامل ہے۔ صدیق الرحمن قدوالی نے ان میں سے کچھ اشعار کو اپنے انتخاب میں درج کیا ہے۔

کلیات اکبر کی چوتھی جلد کراچی سے ۱۹۲۸ میں ضرور چھپی، لیکن وہ ہندوستان میں بہت کم لوگوں تک پہنچی، اور پاکستان میں بھی اب شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ ایک تازہ اطلاع کے مطابق اس جلد کا وہ نسخہ جو مولانا عبدالمajid دریابادی کی ملک تھا، اب دریافت ہو گیا ہے۔ مکتبہ شان ہند کے کلیات اکبر کو عالمانہ یا اختیاردار ایڈیشن نہیں کہہ سکتے۔ قومی کوںل برائے

فروع اردو اب ایک مکمل ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔ یہ ایڈیشن ہر چند کہ عالمانہ اور تنقیدی نہ ہوگا، لیکن اس میں صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ عبدالماجد دریابادی کے نئے پر جو حواشی اور ضروری معلومات مولانا دریابادی نے درج کئے تھے، وہ اس ایڈیشن میں شامل ہو جائیں۔

اہذا موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سب سے بڑے طنز نگار کی حیثیت سے اکبر کی شهرت کو کوئی بٹھ نہیں لگا ہے، لیکن ان کے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اردو کے نقادوں نے کم و بیش یک زبان ہو کر ان کی نکتہ چینی کی ہے کیوں کہ اکبر نہیں ترقی، سامنس، اور روشن خیال طرز فکر و حیات کے دشمن نظر آتے ہیں۔

ہمارے نقادوں نے اکبر کے ساتھ جو سلوک کیا، بلکہ یوں کہئے کہ جو بد سلوکی روارکھی، اس کی کم از کم دو جہیں اور ہیں۔ ایک وجہ تو ادبی ہے، اور دوسری غیر ادبی۔ ادبی وجہ تو یہ ہے کہ اردو نقادوں کی فہرست استناد میں طنز یہ اور مزاحیہ شاعری بہت پست مقام کی حامل ہے۔ اردو میں طنز یہ مزاحیہ شاعری کی روایت بے شک بہت تو انگر اور تو انا ہے، لیکن اوائل بیسویں صدی کے اردو نقادوں کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ وہ میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) کی اس بات کو بحق سمجھتے تھے کہ ”اعلیٰ سنجیدگی“ (High seriousness) شاعری کا جزو لاتینیک ہے۔ کوئی پچاس برس ادھر کا اپنا تجربہ بھی مجھے اب تک یاد ہے کہ مجھے اس وقت کتنا رنج اور کس قدر رزیادتی اور دھوکے کا احساس ہوا جب میں نے آرنلڈ کا یہ قول پڑھا کہ انگریزی کے مشہور طنز نگار شعرا، ڈرامڈن (John Dryden) اور پوپ (Alexander Pope) انگریزی شعر کے نہیں، بلکہ انگریزی نثر کے شاہکار ہیں۔ اگر میرے اساتذہ اس رائے کو پوری طرح تسلیم نہ بھی کرتے تھے

تو انہیں یہ فیصلہ دینے میں کوئی جھجک بھی نہ ہوتی کہ ڈرائیور درجہ دوم کا شاعر ہے۔ اس پر طرہ محمد حسین آزاد کی تقدیمیں اور تعریفیں کہ طنز اور ہجو ”غیر مہذب“، اضاف ہیں، بالخصوص جب سودا جیسا شاعر انہیں برتے۔ سودا کے بارے میں محمد حسین آزاد کو سنئے:

بڑھاپے تک شوخی طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی
... ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس
نہ چلتا تھا، جبکہ ایک ہجو کا طومار تیار کر ڈالتے تھے۔ غنچہ نام
ان کا غلام تھا، ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلم دان
لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے، ارے
غمچہ لا تو قلم دان.... پھر شرم کی آنکھیں بند۔ اور بے حیائی کا
منہ کھول کر وہ بے نقط نہ اتے تھے کہ شیطان بھی امان
مانگے۔

یہ باتیں اس نتیجے کے لئے کافی تھیں کہ اردو کے نقاد تمام ظریفانہ اور طنزیہ شاعری کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں۔ اکبر جس جوش اور قوت کے ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل کے ساتھ اپنی شاعری میں معاملہ کرتے تھے وہ ان کی گری ہوئی پوزیشن کو سنبھالنے کے لئے کافی نہ سمجھا گیا۔ آج شاید ہی کوئی اردو کا نقاد ایسا ہو گا جو اکبر کو اردو کے دس بڑے شعرا میں شمار کرے۔ سرورِ صاحب اُن چند نقادوں میں ہیں جنہوں نے اکبر کے مقاصد کی متانت اور وزن کو سمجھا، اور ان کی بصیرت کی قوت کا اعتراف کیا۔ انہوں نے کہا کہ ”آپ ان کے خیالات سے اتفاق نہ بھی کریں، مگر ان کے اشعار پر مسکرائے اور اکثر غور کئے بغیر نہیں۔

رہ سکتے۔ یہی ان کا مقصد تھا۔^۵ لیکن اکبر کے لئے تاحیات جذبہ تحسین رکھنے کے باوجود سرو ر صاحب بھی خود کو اس بات پر تیار نہ کر سکے کہ اردو کے عظیم ترین شعراء کی محفل میں اکبر کے لئے بھی جگہ استوار کی جائے۔

موجودہ زمانے میں اکبر کی مقبولیت کم ہونے کی ایک وجہ ان کی ذاتی زندگی اور ان کے سیاسی عقائد کے درمیان تضاد کی واضح خلیج بھی ہے۔ اپنے شعر میں تو اکبر خود کو تمام انگریزی طور طریقوں کا سخت دشمن ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن وہ خود انگریزی راج کے ایک خاصے بزرگ عہدے دار تھے، اور انھیں صاف صاف اس بات پر فخر بھی تھا کہ نامس برن (omas Burn) جو ایک زمانے میں یو۔ پی۔ کا چیف سکریٹری تھا، ان کا بہت لحاظ کرتا تھا۔^۶ ملکہ وکتوریہ کی گولڈن جوبی (۱۸۸۷ء) کے موقعے پر انھوں نے ”مرثہ ہاویل، بجع“ کی فرمائش پر ایک مدحیہ قصیدہ بھی لکھا۔^۷ انگریزوں سے سخت نفرت کے باوجود اکبر نے اپنے بیٹھ عشرت حسین کو اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجا اور پھر ان کا یو۔ پی۔ کی سول سروس میں بطور ڈپٹی کلکٹر شریک ہونا بھی منظور کیا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا کوئی جوڑ نکتہ چینی کے ان فقروں اور ان طنز بھرے تحقیری اشعار سے نہیں جو اکبر کی زبان قلم سے اہل مغرب اور ان کے مذاہوں کے لئے مسلسل ادا ہوتے رہتے تھے۔

اس بات کا امکان ہے کہ اکبر کو اس تضاد کا احساس رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذاتی زندگی میں اس دورانگی^۸ کے احساس نے ان کے یہاں زجر و ملامت کی لے اور تیز کر دی ہو اور مغرنی، خاص کر برطانوی طور طریقوں اور نظام حیات سے ان کا اظہار براءت شدید تر کر دیا ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ دھارے کے خلاف کوئی تیر

نہیں سکتا، لیکن ان کی نگاہوں میں اصل الیہ کچھ اور تھا۔ اکبر کے خیال میں الیہ درحقیقت یہ تھا کہ وہ لوگ بھی غرقابی سے نہ فوج سکے جنہوں نے دھارے کے ساتھ بہنا پسند کیا۔ خود کو جدید (انگریز) بنانے کے چکر میں ہندوستانیوں نے اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنے نظام عقائد، سب تجدی نہیں کی تو قع مکالی (Macaulay) کو تھی مندرجہ ذیل شعر میں دل سوزی الیہ در دمندی کی حد کو چھوڑتی ہے۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کرلی
نے جنم کی تمنا میں خود کشی کرلی⁹
غور طلب بات یہ ہے کہ شعر میں فاعل کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ خود کشی کرنے والا
واحد غائب، واحد متکلم، جمع غائب، جمع متکلم، واحد حاضر، جمع حاضر کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ ایک
سبھا طویل قطعے میں اکبر نے اسی کشمکش کا اظہار ایک ذاتی درد اور احساس زیاد کے ساتھ کیا ہے،
لیکن یہاں بھی متکلم کوئی فرد واحد بھی ہو سکتا ہے اور اس زمانے کے متوسط گھرانے کا پورا مسلم
معاشرہ بھی۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیئے تو وہ ادھرنہ ادھر زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمدیڈ بھی چھوٹیں سکتے ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک ادھر ہے وجی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دو گونہ عذاب است جان مجنوں را بلاے صحبت لیلی و فرقہ لیلی¹⁰

اکبر کے قدح خواں (اور قریب قریب سب ہی جدید نقاد اکبر کے قدح خواں ہی ہیں) مندرجہ بالاطرح کے اشعار اور نظموں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور سارا زور اکبر کے اسی کلام پر صرف کرتے ہیں جس کی رو سے انھیں نئی روشنی کا انداہ اور استدلال سے عاری نقاد ثابت کیا جاسکے، یا پھر یہ دکھایا جاسکے کہ اکبر جان بوجھ کر الٹی گنگا بہانا چاہتے تھے کہ وہ جس ماضی کے دلدادہ تھے وہ عموماً ناپسندیدہ اور بہر طور مردہ یا نزع کی حالت میں گرفتار تھا۔ اور اکبر کے بارے میں یہ فیصلہ صرف ان لوگوں کا نہ تھا جو برطانوی راج کو ہندوستان کے لئے باعث برکت نہیں تو تاریخ کے سفر کا ایک ضروری پڑا ویقیناً قرار دیتے۔ اکبر کے لئے ہمدردی ان لوگوں کے بھی دل میں نہ تھی جو برطانوی راج کے مخالف تھے اور اس سے انھیں کچھ لینا دینا نہ تھا۔

اکبر کے بارے میں زیادہ تر جدید تنقید میں تصور کی تہہ دار، اور بعض اوقات بالکل کھلی کھلی رائے یہی ہے کہ ٹھیک ہے، وہ اپنے زمانے میں بے حد مقبول تھے اور عمدہ طنزیہ شاعر تھے، لیکن جن اقدار، تصورات اور آدراشوں کو وہ قیمتی گردانتے تھے انھیں تو اکبر کے میں حیات، ہی میں شکست فاش نصیب ہو چکی تھی۔ لہذا جب وہ اقدار ہی نہ رہے جن سے اکبر کی شاعری کو ایقان اور عقیدے کا سہارا تھا، تو پھر ناگزیر ہے کہ ان کی شاعری دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دے۔ نقادوں کا کہنا یہ ہے کہ اکبر کا گوشوارہ عمل منفی ہے، اس لئے ان کی شاعری بھی منفی ہے، اور ہم اسے آج کے جدید دور میں کسی قوت کا حامل دیکھ سکتے ہیں نہ معنویت کا۔

لیکن یہ بات ہی غلط ہے کہ جو لوگ، پارٹی، یا تصورات، جو کسی طنز نگار کا ہدف تھے ان کی شکست یا موت کے ساتھ ان کے بارے میں لکھی ہوئی طنزیہ تحریر بھی متروک یا ناقول ہو جاتی ہے۔ اگر طزو مزاح صرف وقتی اور مقامی معنویت کی شے ہیں، اور زمانہ بد لئے

یا گزرنے کے ساتھ ان کی قیمت، معنویت، یا اہمیت کم ہو جاتی ہے تو یونان کے ارسطوفینیس (Aristophanes) سے لے کر سنسکرت کے طنز و ہجونگاروں تک، پھر عرب و ایران کے (نخش یا غیر نخش) ہجو گویوں سے لے کر انگریزی کے جانشین سوئفت (Jonathan Swift) اور اردو کے جعفر زمیلی تک سینکڑوں مصنف ہیں جن کی بہت ساری نظم و نثر آج ہمارے لئے بے معنی ہوتی، بلکہ وہ آج باقی ہی نہ ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اور اس طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اکبر کی طنزیہ شاعری کو ہم صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے کہ زمانے کے ساتھ اکبر کی معنی خیزی بھی گذر گئی اور آج وہ دفتر پاریس ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مسائل کی طرف، اور خاص کر ”ترقی“ سے متعلق مسائل کی طرف اکبر کا رودیہ اتنا سادہ اور سیدھی لکیر جیسا بھی نہ تھا جیسا کہ ان کے نقاد ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں۔ اکبر بڑے پیچیدہ شاعر ہیں۔ انھیں صحیح کے اخبار کی طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔ اکبر کے شکوہ اور خوف اور آئندہ زمانے کے بارے میں ان کی تاریک پیشین گوئیاں صرف ایک ضدی قدامت پسند ڈھن کی پیداوار نہیں۔ ان میں کچھ اور بھی ہے۔

چچ پوچھئے تو اکبر اپنے زمانے کے ان چند لوگوں میں تھے جنہوں نے یہ بات دیکھ لی تھی کہ سر سید کے اصلاحی گوشوارہ عمل اور لارڈ میکالی (Lord Macaulay) کے منصوبوں میں بہت کچھ مشترک تھا۔ اکبر خوب سمجھتے تھے کہ جس چیز کو ”ہندوستانی نشاۃ الثانیہ“ کہا جا رہا ہے، یا کہا جائے گا، وہ چھپھلی جدید کاری کی ایک طاقتور لہر کے سوا کچھ نہیں۔ سر سید کے ”انگلو اورینٹل کالج“ (Anglo-Oriental College) علی گڑھ میں بہت کم غصر ایسا تھا

جسے ”اینگلو“ (انگریزی) کہا جاسکتا تھا اور ”اورینٹل“ (مشرقی) عصر تو اس سے بھی کم تھا۔ ارادے اور ذہن کی اپنی تمام ترقوت اور نیک نیتی کے باوجود سر سید کے پاس وہ ساز و سامان نہ تھا، اور نہ ہی وہ صلاحیت تھی کہ وہ جدید سائنسی چہان میں اور مذہبی عقیدے دونوں کے امتزاج پر مبنی کوئی واحد ذہنی نظام تیار کر سکیں۔ یورپی روشن فلکری (Enlightenment) کے معاصر نظام افکار میں سائنسی اور تفہیمی رویوں اور تصور کائنات کی کارفرمائی تھی، اور برطانوی تہذیب اس نظام افکار کی نمائندگی بھی خوب کرتی تھی۔ لیکن اس نظام افکار اور تصور کائنات کو آزادانہ اور دانشورانہ طور پر اختیار کرنا دیگر بات تھی، اور غالباً مانہ، یا خوشامانہ، اور کم و بیش ایک کم تر درجے کے معاون کے طور پر اس کی تحسین اور انگریزی نوآبادیاتی و انتظامی ڈھانچے میں ہندوستان کی شرکت اور چیزیں تھیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکمت عملی اس بات پر بنی تھی کہ جدید سائنسی فلکر ہندوستان میں آئے ضرور، لیکن وہ انگریز کے نوآبادیاتی و انتظامی ڈھانچے کی تحسین اور اس کے ساتھ تعاون کے طور پر آئے۔ یعنی اگر نئے علوم و افکار کو حاصل کرنا ہے تو انھیں انگریزوں کی دین کے طور پر ہی حاصل کرو۔ انگریزوں نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ دونوں چیزیں (جدید علوم و افکار اور انگریزی سامراج سے خوش عقیدگی) ساتھ ساتھ آئیں۔ یہ ایسی حقیقت تھی جو اکبر کے زمانے میں تمام ہندوستانیوں پر افشا نہیں تھی۔ انیسویں صدی کے اوآخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہماری تہذیبی تاریخ میں اکبر اور اقبال کے سوا شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جس نے اس حقیقت کا احساس و اظہار اس قدر روز و رقبوت سے کیا ہو۔ اور خاص کر اکبر تو یہ بات کہتے نہ تھکتے تھے کہ یہ محض خوش خیالی اور پر امیدی ہے، ان دورویوں کا کیجا ہونا اجتماع نقیضیں کا

حکم رکھتا ہے، اور ان پر بیک وقت ایک ہی عالم میں عمل پیرا ہونا غیر ممکن ہے۔

اکبر کو اپنے طور پر سر سید سے محبت بھی تھی۔ سر سید کے خلوص نیت، خلوص عمل، مشقت برائے قوم، تعلیم، اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے مقصود سے ان کے دلی لگاؤ کی وہ قدر کرتے تھے۔ لیکن سر سید اور ان کی جسمانی اور معنوی اولادوں کا جب موازنہ کرتے تو ”ولادوں“ میں انھیں بہت کم باتیں قابل تعریف نظر آتیں، جب کہ علی گڑھ کے بڑے میاں کے لئے ان کے دل میں جگہ تھی۔ یہ شاید بے وجہ نہیں کہ ”کلیات اکبر“ کی ابتداء ایک غزل سے ہوتی ہے جس کے تین شعر بالترتیب حسب ذیل ہیں۔

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے کر دیا کعبے کو گم اور کلیا نہ ملا
رنگ چہرے کا تو کانج نے بھی رکھا قائم رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا
سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا”
جیسا کہ صاف ظاہر ہوگا، پہلے شعر میں ہندوستانیوں، اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کے کنج دار و مریز کا، اور اس کو حل کرنے میں ان کی ناکامیوں کا ذکر ہے۔ اس شعر کا ہدف سر سید تو ہیں ہی، لیکن اس کے سماجی اور اخلاقی مضمرات دور دور تک ہیں۔ دوسرے شعر میں سر سید کو بالواسطہ خراج تحسین ہے کہ خود ان کا دل تو صحیح مقام پر تھا۔ لیکن ان کی اولادوں نے باپ دادا کے روحاںی اور دانشورانہ درستے کو ضائع کر دیا۔ تیرے شعر میں واضح طور پر سر سید پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ان کے طریق فکر و عمل نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ قرآنی طرز حیات و فکر کو چھوڑ کر انگریزی طرز حیات و فکر اختیار کریں۔

سرسید کے انتقال پر اکبر نے دو شعر کا ماتمی قطعہ لکھا۔ اس میں انہوں نے سرسید کی راست نیت اور مشقت برائے قوم کا پورا اعتراف کیا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھول فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اسے اکبر خدا بخش بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں ۱۲

جب سید محمود اللہ آباد ہائی کورٹ کے نجج مقرر ہوئے تو انھیں یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ ہائی کورٹ کے انگریز نجج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات اور ہندوستانی نجج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات یکساں نہ تھیں۔ دونوں کے فرائض اور اختیارات ایک ہی تھے، لیکن انگریز جوں کو ہر چیز میں ہندوستانیوں پر تفوق تھا۔ کچھ مدت بعد سید محمود نے حکومت کے نام ایک محضر تیار کیا جس میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں اور انگریز نجج صاحبان کو شرائط ملازمت اور مراعات میں ہر طرح برابر قرار دیا جائے۔ اس مطالبے کی بنیاد انہوں نے اصول مساوات و معدلت کے بجائے اس بات پر رکھی تھی کہ انگریزی زبان کے علم، انگریزی تعلیم، انگلستان میں قیام، رکھرکھاؤ اور طرز بودو باش کے لحاظ سے وہ ہر طرح انگریز تھے۔ ۱۳ ظاہر ہے کہ یہ بات اکبر اللہ آبادی کے بھی کان میں پڑی ہو گی، کہ وہ بھی اس وقت کی یو۔ پی۔ جوڈیشل سروس میں اچھے عہدے پر تھے۔ سید محمود کے طرز فکر و استدلال میں اکبر کو اپنے بدترین خوف اور شکوک پچھے نظر آئے ہوں تو کیا تعجب ہے۔ آگے چل کر انہوں نے سید محمود اور اللہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سرجان ایج (Sir John Edge) کے درمیان ناجاہی، چیف جسٹس کے نجیب و غرور، اور پھر ہائی کورٹ کی بھی سے سید محمود کے استعفے کا قصہ نامرضیہ بھی سنایا ہو گا۔

ان باتوں نے اکبر کو اپنے خیالات پر اور بھی مستحکم کیا ہوگا اور انہوں نے اپنے موقف کو اور بھی مبنی برحق سمجھا ہوگا۔ ان کا اس بات پر سخت غم و غصہ رہا ہوگا کہ سید محمود جو ایک انتہائی قدیم اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جنہیں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی ادب کی بھی کثیر معلومات تھی، اور جو ہندو مسلم تہذیب کی بہترین روایات کے پروردہ تھے، ان جیسا شخص اپنی انگریزیت کی توثیق اس غلو کے ساتھ کرے کہ مشرقیت کا بالکل پتہ ہی نہ باقی رہے۔ پھر یہ کچھ حیرت کی بات نہیں کہ سید محمود کے انقال (۱۹۰۳) پر اکبر کا قطعہ اگر ایک طرف مختصر امامت دارانہ ہے تو دوسری طرف اس میں ایک تلحیث مندی بھی نمایاں ہے۔

نہ وہ بک رہ گئے نہ سر سید
دل احباب سے نکلتی ہے آہ
ذات محمود سے تسلی تھی لی انہوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ اے حریصان شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقشِ احمد و محمود رہ گیا لا الہ الا اللہ^{۱۳}

اہذا اکبر کے تضادات ان کے اپنے زمانے کے تضادات تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آخری دنوں میں وہ اپنے ان داخلی تضادات کے حل کی طرف ٹولتے ہوئے ہی، لیکن بڑھ رہے تھے۔ اپنی زندگی کے بیشتر ایام میں ہندوستانی محاورے میں ”گورمنٹ سرونٹ“ (Government Servant) اور پھر ”پرنٹرنج“ رہے تھے۔ اور وہ اپنے اندر یہ قوت نہ دیکھتے تھے کہ وہ جدوجہد آزادی اور مہاتما گاندھی کی کھلی حمایت کریں اور عملی سیاست میں کوڈ پڑیں۔ لیکن انگریز، انگریزی راج، مغربی تہذیب، اور ان کے جملیتوں پر کھلے الفاظ میں نکتہ چینی میں وہ کبھی پیچھے نہ رہے۔ اور یوں بھی، شاعر کا کام ڈنڈا یا جھنڈا اٹھانا نہیں۔

”گاندھی نامہ“ کے بہت پہلے انہوں نے دوالگ الگ شعروں میں کہا تھا۔
مدخولہ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں^{۱۵}

☆☆☆

بدھومیاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں گوخار کراہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں^{۱۶}
اکبر نے اپنے لئے لفظ ”مدخولہ“ استعمال کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی
حکومت کے ملازموں کو وہ بیگم کے مقابلے میں داشتہ سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ اس سے
یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بلند مرتبہ دنیاوی حیثیت کے باوجود انھیں اپنے آپ سے ایک طرح کی
نفرت تھی کہ وہ انگریز کے نوکر تھے۔ مہاتما گاندھی کے پیروؤں کو اکبر نے ”گوپی“ کہا ہے۔ اس
طرح گاندھی جی کی شخصیت ان کی نگاہ میں غیر معمولی طور، بلکہ تقریباً فوق الانسانی طور پر کر شمہ
جائی حیثیت رکھتی تھی۔ لفظ ”گوپی“ کے استعمال اور سری کرشن جی مہاراج کی طرف اشارے
کی بناء پر اس شعر میں معنی کی متعدد تھیں ہیں۔ یہاں میں صرف ایک کی طرف توجہ دلانا
چاہتا ہوں۔ وطن عزیز کے لئے مہاتما گاندھی اصول مردی اور قوت تولید اور زرخیزی کا درجہ
رکھتے ہیں۔ وطن عزیز اصول نسائی کا حکم رکھتا ہے، جسے گاندھی کے وجود سے قوت نمو اور زرخیزی
حاصل ہوگی۔ دوسرے شعر میں اکبر نے ”بدھومیاں“ کی اصطلاح یا علامت خود اپنے لئے
استعمال کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد علی کو گمان گذرا تھا کہ ”بدھومیاں“ کو اکبر نے خود
مولانا محمد علی کا مدلول بنایا تھا۔ مولانا اس پر شاید کچھ آزر دہ بھی ہوئے تھے اور اکبر نے صفائی پیش
کی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ ”گاندھی نامہ“ کے ایک شعر میں صاف اشارہ ہے کہ ”بدھومیاں“ سے
کوئی اور نہیں بلکہ اکبر الہ آبادی ہی مراد ہیں۔

بدھو کا لفظ تھا فقط اک مصلحت کی بات دل میں مرے نہاں ہے جو ہے اصلیت کی بات ۷

اکبر نے ”گاندھی نامہ“ اپنی حیات میں شائع نہ کیا۔ قمر الدین احمد کا بیان ہے کہ اکبر کہتے تھے کہ میں انگریزوں کی مخالفت کھل کر کروں تو یہ بے اثر اور نقصان دہ بات ہوگی۔ انھوں نے قمر الدین احمد سے ایک بار کہا کہ ”جب میرا یقین ہے کہ حکومت سے کھل کر لڑنا مضر ہے تو بھلا میں کیا کھوں، اور میرے کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہے؟“ زندگی کے بالکل آخری دنوں (فروری، ۱۹۲۱) میں اکبر نے قمر الدین احمد سے کہا:

لوگوں کا خیال ہے میں اپنی پیش کے خیال سے قوی کام میں سامنے نہیں آیا۔ یہ غلط ہے۔ اگر آج میں روپے کی خاطر قوم کا کام کروں تو کیا مجھ کو پیش سے زیادہ فائدہ نہ ہو؟... میں دو باتوں سے گھبراتا ہوں، ایک تو عشرت کے مصیبت میں پڑنے کے خیال سے، دوسرے اس خیال سے کہ میں اس پیرانہ سالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مصائب اٹھاسکوں۔“ ۱۸

لیکن ”گاندھی نامہ“ میں اکبر پوری طرح کھل کھیلے۔ انھوں نے کتاب کے سر نامے ہی پر یہ شعر لکھا۔

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے شاہ نامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے ۱۹ گویا وہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ فردوسی کا شاہنامہ جو ملک گیری اور کشورستانی کے اصول پر مبنی ہے، اب اس کا زمانہ ختم ہوا، یعنی انگریزوں کی ملک گیری کے دن گئے، اب گاندھی، یعنی عوام الناس کے اصول کی داستان کا زمانہ ہے۔ شاہی اور کشورکشائی کے دن منسوخ ہوئے۔

اکبر کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ سیاسی فاتحوں کے طور طریقوں میں سیاسی مفتوحوں کے لئے کس قدر کشش اور جاذبیت ہوتی ہے۔ مفتوح خود کو فاتح کے رنگ میں رنگ لیتا چاہتا ہے تاکہ تقاضات مابین کم ہو۔ اور اکبر کے زمانے کی ہندوستانی زندگی اور ادب میں بے شمار مثالیں اس بات کی موجود تھیں کہ مفتوح قوم کو غیر شوری طور پر اس بات کی طرف راغب کیا جاسکتا ہے کہ وہ فاتح قوم کے اندر حاکم طبقے کے ساتھ اتحاد و ہمنی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مفتوح قوم کی روزمرہ تہذیب میں فاتح تہذیب کے طاقتوں اور مقبول علامم اور نشانات داخل کر دئے جائیں۔ مفتوح کو فاتح کی طرف مائل کرنے کے لئے تہذیبی حربے اگر سیاسی حربوں سے زیادہ موثر نہیں تو ان کے برابرا انگلیز یقیناً ہیں۔

اکبر کی اہم ترین بصیرت یہ تھی کہ انھوں نے نوآبادیات کا رقوم کی تہذیب اور اس کی سیاست، اس کے نظم حکومت، اور اس کے ضوابط کو متحدد قرار دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریز کو جواب دیا تو شاعری کے ذریعہ، کہ ہندو مسلم سماج میں شاعری سے زیادہ موثر اور قوت مند کوئی دوسرا تہذیبی حربہ نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ”گاندھی نامہ“ کو شاہنامہ فردوسی کے مقابل رکھتے، حالانکہ ”گاندھی نامہ“ کئی مختصر اور سیاسی طور پر واضح منظومات کا مجموعہ ہے، اور شاہنامہ فردوسی میں زمین پر قبضہ جمانے اور غیر اقوام کو بزرگی ملک بنانے کی طویل داستانیں ہیں۔

اس کے برخلاف ”گاندھی نامہ“ میں غیر قوم کو اپنے ملک سے بے دخل کرنے کی باتیں ہیں۔ یہ باتیں آج کل فیشن کے طور پر مقبول ہیں کہ آج کے مابعد نوآبادیاتی دور میں مغرب کی سامراجی، سرمایہ پرست تہذیب محیط الارضی (global) اقدار و تصورات کے نام پر ہماری تیسری دنیا کی تہذیب کو اپنا ملک بنانے کے درپے ہے۔ فیشن کے طور پر کہی جانے کے باوجود

یہ بات ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے اپنے اندر صداقت کا بڑا عنصر رکھتی ہے کہ مغرب کی تمنا ہے کہ تیری دنیا کے لوگ اس کے تہذیبی اقدار و اطوار کو تاحد امکان قبول کر لیں۔ تہذیبی علامت کی سیاسی معنویت کو سمجھنے والوں میں اکبر ہمارے یہاں سب سے پہلے تھے۔

یورپ میں گوہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی۔ لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ دیکھو مگر پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ ۲۰ آلات رسل و رسائل میں ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ تجارت اور زندگی اور عشق کرنے کے بھی طریقوں میں ”ترقی“ اور تبدیلی آتی ہے۔

اب کہاں دست جنوں تار گریاں اب کہاں پانیر اور دست مجنوں اور خبر ہے تار کی لے لیا شیریں نے مسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی ۲۱

☆☆☆

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹی رہے ہیں ۲۲

☆☆☆

میں ہوا ان سے رخصت اے اکبر وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر ۲۳
ہندوستان میں انگریزوں کے طرز حکومت کو خود انگریز حکام نے اکثر ”جا برانہ“ لیکن مہربان، اور قانون کا پابند (benevolent despotism, and the rule of law) کہا ہے۔
جا بریت چاہے جتنی بھی مہربان کیوں نہ ہو، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ قواعد و ضوابط بکثرت نافذ کرتی ہے۔ اکبر کی نگاہ میں برطانوی قواعد و ضوابط کا وفور ایک طرح کا تہذیبی حملہ تھا کیوں کہ اس کے باعث ہندوستانیوں کو اپنا طرز حیات بد لئے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

اکبر نے اکثر اس قواعدی و فور کے لئے "لینس" کا استعارہ بردا ہے
ہر گام پہ چند آنکھیں غمراہ ہر موڑ پہ اک لینس طلب اس پارک میں آخراء اکبر میں نے تو نہ لانا چھوڑ دیا"

راہ میں لینس ہی کافی ہے عزت کے لئے بس یہی لے لیجئے تلوار رہنے دیجئے ۵

پوچھتے کیا ہو کہ پیرو ہے یا ہرنس ہے بندہ جو کچھ ہو بہر حالت بلا لینس ہے ۶
اکبر الہ آبادی کی لئی ہوئی دنیا میں صرف ان چیزوں کے زیاد کا درد نہیں جو کھو گئیں۔
انگریزوں کا مفتوح اور زیر نگیں ہندوستانی جب ان کے نو آبادیاتی نظام کا حصہ بناتو اس نے
جو ش وفاداری میں انگریز کے بھی کان کاٹ لئے اور "جا بر لیکن مہربان" دیسی افسر بدیسی سے
بڑھ کر استبداد پسند نکلا۔

تمہد میں بُن جب لگنے لگے جب دھولی سے پتوں اگا ہر پڑپ پاک پھرہ بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اگا ۷

اکبر کے کلام کا وہ حصہ جدید نقادوں کے لئے سب بے زیادہ بڑھی کا باعث بنا ہے
جہاں وہ پائپ کے پانی اور چھاپے خانہ اور اخبار اور ریل گاڑی جیسی کھلی ہوئی منفعت بخش
ایجادات کو بھی بظاہر مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرسری نظر سے پڑھئے تو واقعی تعجب،
بلکہ افسوس بھی ہوتا ہے کہ اکبر نے جدید اور روشن خیال زندگی کی ایسی کارآمد اور ضروری اشیاء کو
خیر مقدم کرنا تو کجا، انھیں اپنے یہاں بار دینے سے بھی انکار کیا۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہے۔
اکبر کا احتجاج ترقی کے ان نئے وسائل کے خلاف نہ تھا۔ ان کا احتجاج یہ تھا کہ ان کی نظر میں یہ
چیزیں غلامی کی علامت تھیں، اور یہ کہ نام نہاد ترقی اور بہتری کے پردے میں یہ تبدیلیاں ہندوستانی

طرز معاشرت اور تہذیب کو تباہ کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں (مثلاً پانی کے نسل کے ذریعہ گھر بیٹھے پانی کی سہولت) کا فائدہ تو چند ہی لوگ اٹھا سکتے تھے، لیکن اکبر کی نگاہ پانی کے پائپ کے ساتھ واٹر ٹسکس، سڑکوں پر کچڑا اور آب استادہ کی فراوانی، اور اس کی پیدا کردہ ماحولیاتی آلودگی پر بھی تھی۔ شہروں میں واٹر کس کے قیام کا ایک ناپسندیدہ نتیجہ ان کی نظر میں یہ بھی تھا کہ زندگی سے کنویں غائب ہونے لگے، اور روزانہ استعمال کے پانی کے سرچشمے کے طور پر ندیوں کا استعمال ختم ہونے لگا۔ علاوہ ازیں، انھیں یہ بھی احساس تھا کہ یہ نئے طریقے شہروں کی اقتصادی زندگی اور قدرتی ماحول پر برابر اثر ڈال رہے ہیں۔

طاوون و تپ دھمل پھر سب کئے ہے یہ پیدا کچڑے یہ کی روائی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف ۸

☆☆☆

کشت دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے دیدہ گریاں پہ واٹر ٹسکس کی تجویز ہے ۹

☆☆☆

یہ مونج فیض ہے تہذیب کی یا اس کا طوفاں ہے کنوں موجود ہے گھر میں تو پھر پانی کا نسل کیسا ۱۰
اس بات کی وضاحت چند اس ضروری نہیں کہ گھر کے کنویں کو پانی کا ایسا سرچشمہ قرار دینا جو گھریلو، خالص، اور استعمال کنندہ کے پورے قابو میں ہے، کنویں کو پوری ہندوستانی تہذیب کی علامت بنانے کا پیش کرنا ہے۔ اور میرے خیال میں اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبدیلی کا مطلب اکبر کی نظر میں کیا تھا؟ ہم میں سے جو لوگ کرشن لیلا، اور ندی کنارے یا پنگھٹ پر گوپیوں اور پانی بھرنے والیوں کے ہجوم، وغیرہ باتوں کی تہذیبی اہمیت سے واقف ہیں وہ اس نکتے کو زیادہ طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ حساس دل والوں کے لئے ایسے پانی کا تصور کس

قدرتا پسندیدہ ہو گا جو تجارتی مال کی طرح کسی کمپنی یا ادارے کے قبضے میں ہو اور لوگ اس بات پر مجبور ہوں کہ پانی جیسی چیز بھی کمپنی یا ادارے سے قیمتا حاصل کریں۔ پانی کی رسدا اور تقسیم کے نئے طریقوں کے باعث ان تہذیبی اقدار و روایات، اور اس ادبی اور افسانوی سرماۓ کے محو ہو جانے کا امکان تھا جن کا تعلق کنویں، پنگھٹ، ندی کے گھاث، اور باہر سے یا کچھ فاصلے سے پانی لانے اور لے جانے سے تھا۔

وہ ذہن جو ہندوستانی روایت کی گود میں پلا بڑھا تھا، اس کے لئے کنوں محض کنوں اور دریا محض دریا نہ تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ندی اور کنوں کے پانی کی کوئی قیمت نہ تھی اور اس کی تجارت نہ ہوتی تھی۔ دیہات میں بھی، جہاں ذات پات کی تفریق یاد دوسرا وجہ کی بناء پر کنوں بٹے ہوئے تھے، کسی کنوں سے پانی کا استحقاق رکھنے والے بے قیمت پانی لیتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ کیفیت اور کیمیت دونوں اعتبار سے کنوں یا ندی کے پانی پر پانی نکالنے والے کا اختیار تھا، یعنی وہ جانتا تھا کہ یہ پانی کیسا ہے اور کتنا ہے۔ پائپ کے پانی میں یہ بات نہ تھی، کہ یہاں تو صارف کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔ واٹرورکس والے جب چاہتے اور جتنا چاہتے، اور جس رفتار سے چاہتے، پانی مہیا کرتے تھے۔ اور پھر شاید سب سے اہم بات یہ تھی کہ کنوں یا دریا کا گھاث جذبائی اور روحانی لین دین کی جگہ تھے، اور سماجی تہذیبی اور ندی بی زندگی میں ان کی اہمیت تھی۔

دلی جیسے بڑے شہروں میں بھی کنوں کی کتنی اہمیت تھی اس کا کچھ اندازہ غالب کے خطوط سے ہو سکتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے جو آفت ۱۸۵۷ اور ۱۸۵۸ میں دہلی والوں اور دہلی کی عمارتوں پر توزی، اس پر بس نہ کر کے آئندہ کے تین چار برس میں ترقی اور پھر

ریل کی سہولت کے نام پر انگریزوں نے دہلی میں مزید توز پھوڑ کی۔ مجروم کے نام ایک خط
مورخہ ۱۸۶۰ءایا ۱۸۶۱ء میں غالب لکھتے ہیں:

قاری کا کنوں بند ہو گیا ہے۔ لال ڈگی کے کنوں ایک دم کھاری ہو گئے۔

خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوں کا

حال دریافت کرنے گیا تھا... قصہ مختصر شہر صحراء، ہو گیا تھا۔ اب جو کنوں

جاتے رہے اور پانی گوہرنا یا ب ہو گیا، تو یہ صحراء صحراء کر بلبا ہو جائے گا۔ ۳۱

پائپ کا پانی تمام کنوں کی جگہ تو نہ لے سکتا تھا، اور کنوں کے پانی کی طرح

بے قیمت بھی نہ تھا۔ لیکن بات صرف زحمت اور قیمت کی نہ تھی۔ بات دراصل ایک نئی طرح کی

پابندی کی تھی، کہ اب پانی آپ کی مرضی کا تابع نہ تھا، آپ پانی والے کی مرضی کے تابع تھے۔

اگر پائپ نہ چلے تو پانی نہ ملے۔ پانی اب ایک قدرتی وسیلہ نہ تھا بلکہ انسانی مصنوعات کے

زمرے میں آگیا تھا۔

اکبر نے ایک بار قرالدین احمد کو اپنا شعر نیا۔

پائپ کوئی کھلانہیں گھر میں لگی ہے آگ اب بھا گنا ضرور ہوا غور کیا کریں

قرالدین احمد لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس شعر کی توجیہ حسب ذیل بیان سے کی:

[اکبر نے] فرمایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا چوک کی دوکانوں میں آگ لگی۔ اس

وقت پائپ بند ہونے سے رعایا کا سخت نقصان ہوا۔ میں نے مذکورہ شعر

اس خیال سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ کیا کہا جائے۔ صاحب کی۔

آب و دانے پہ حکمرانی ہے

اگر اس وقت زمانہ سابق کی طرح کنوں ہوتے تو آگ بروقت قابو
میں لائی جاسکتی تھی۔ شہروں میں ترمیم و یکھوکہ حکمران طبقہ اور امراء سول
لائن میں ہیں، غرباء کے لئے زیست کے دن گزارنے کے واسطے
شہر کے گندے گوشے علیحدہ ہیں۔ مراد اس سے یہی ہے کہ امیر و غریب
یکجانہ ہوں گے، نہ ایک دوسرے کے دکھ درد سے ہمدردی ہوگی۔ ۳۲

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اکبر نے رعایا کی تفریق اور تقسیم کی بات کی ہے، اور
نئی طبقاتی حد بندیوں کے وجود میں آنے کی طرف جواشارہ کیا ہے، وہ اپنے وقت سے بہت
آگے کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے اوآخر میں کہیں جا کر شہری منصوبہ بندی کے ماہروں اور
ماہرین اقتصادیات نے شہروں میں اس تفرقہ کی برائیاں محسوس کیں جو نئے نظام کے تحت
انگریزوں نے یہاں راجح کی تھیں۔

شفاقی قوت اور سماجی زندگی میں تسلسل کی علامت کے طور پر ہمارے یہاں دریاؤں کی
اہمیت کنوں سے بھی زیادہ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مختلف دریاؤں کا پانی الگ الگ خواص
رکھتا ہے۔ بعض دریاؤں کا تقدس اس پر مستزد تھا۔ یہ بات کچھ غیر معمولی نہ تھی کہ مسافرانے
ساتھ گنگا، یا کسی اور پسندیدہ ندی کا پانی ساتھ لے کر چلتے تھے۔ محمد تغلق (زمانہ حکومت
۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء) جیسا عقلیت کوش سلطان بھی اپنا مرغوب گنگا جل ایک ہزار میل دور دکن دیس
میں ہر روز منگاتا تھا۔ ۳۳

اکبر اعظم کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ گنگا کا ہی پانی پیتا تھا۔ لیکن پانی کے
بارے میں اس کے یہاں اور تکلفات بھی تھے۔ ابوالفضل نے ان دریاؤں کا ذکر کیا ہے

جہاں کا پانی اکبر کے باور پھی خانے میں استعمال ہوتا تھا۔^{۲۳} حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کو ماحول کی آلودگی، پانی کی صفائی، اور اس طرح کی "جدید" چیزوں سے بہت شغف تھا، اور ظاہر ہے کہ اس شغف نے ایک طرف ہندوستانی تہذیب پر اثر ڈالا ہو گا تو دوسری طرف اس شغف کے پیدا ہونے میں خود ہندوستانی تہذیب اور رسم کا بھی دخل رہا ہو گا۔ جہانگیر نے گجرات کے حالات میں لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ پانی کو ٹھیک سے جمع نہیں کرتے ہیں۔ گجرات میں طریقہ تھا کہ صاحب ژوٹ لوگ اپنے تھانوں میں بڑے بڑے حوض بنانے کے لئے لکھا ہے (جہانگیر نے لفظ "برکہ" لکھا ہے) ان میں پانی بھر کر بند کر دیا کرتے تھے، جہانگیر نے لکھا ہے کہ بھلا ایسا پانی کیوں کرنہ مضر ہو گا جسے مہینوں تک ہوانہ لگے اور جس کے بخارات کو اٹھنے اور زائل ہونے کا موقع نہ ہو۔^{۲۴}

آج کے وقت اور مقام کے قریب تر آئیے تو غالب کے خطوط ہیں جن میں دریاؤں کے پانی کا بطور خاص ذکر ہے۔ رام پور کی کوئی ندی کی نہاء میں غالب لکھتے ہیں:

پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوئی، سبحان اللہ اتنا میٹھا
پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک،
گوارا، ہاضم، سر لع النفوذ۔

پانی سبحان اللہ۔ شہر سے تم سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوئی اس کا نام ہے۔
بے شبه چشمہ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے
تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہو گا۔^{۲۵}

اس طرح کے طور طریقوں، رسوم و روانج، اور ندی یاد ریا کے پانی کی اس مرکزیت کے نقصان نے اکبر سے حسب ذیل طرح کے شعر کہلائے۔ ہم انھیں قدامت پرستی کا اظہار سمجھیں تو یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے ۲

شاہ ایڈورڈ کی دہائی میں طنز کی معراج ہے، اس کی وضاحت شاید ضروری نہ ہو۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ٹائپ کے حرف کے خلاف احتیاج صرف اس بناء پر نہ تھا کہ ٹائپ کے حرف چھوٹے ہوتے تھے۔ یہ معاملہ طریق پیداوار اور بلندی معیار پر مصنف کے قابو کا بھی تھا۔ طباعت کے زمانے کے پہلے کتابیں اکثر کسی خطاط سے نقل کرائی جاتی تھیں اور خطاط سے کام لینے والا شخص، جو اکثر مصنف ہی ہوتا تھا، اکثر اس کے کام پر ذاتی نگاہ رکھتا تھا۔ اور چونکہ ہر کتاب گویا اپنی جگہ پر بے نظیر تھی، اور خطاط اسلوب تحریر، روشنائی، سجادوٹ، جنم اور تقطیع، ہر چیز میں صاحب معاملہ کی مرضی کا پابند تھا، لہذا اس طرح جو کتاب تیار ہوتی تھی، اصولاً وہ اغلاط سے آزاد اور مطلوبہ معیار کی ہوتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ چھاپے خانے سے نکلنے والی کتاب پر مصنف کا کچھ واقعی قابو نہ تھا۔ لیکن اغلاط کے لئے بسا اوقات مصنف ہی کو مورد الزام ہٹھرا یا جاتا تھا۔

غالب کی مثال سامنے کی ہے۔ وہ اپنی کتابوں پر مطبع کا نہیں، بلکہ اپنا قابو چاہتے تھے تاکہ معیار سے تجاوز نہ ہو۔ ان کے خطوط میں جا بجا کا تب یا پر لیس یا پروف پڑھنے والے کے بارے میں شکایت ملتی ہے۔ ”تبو“ کی طباعت کے نگران مرزاق تھے، انھیں نہایت اصرار سے غالب لکھتے ہیں: ”کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور رخشنده ہو اور آخر تک رنگ نہ بد لے۔“ اب

دیوان اردو کے بارے میں سنتے:

ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا

وہ اور تھا... وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔^{۳۹}

جنون بریلوی کو غالب نے لکھا کہ کتاب کی غلطی بے وجہ مصنف کے سر مردھی جاتی ہے۔

لوگ ”نسخہ مطبوعہ میں غلطی کا احتمال جائز نہیں رکھتے۔ کاپی نویس کے جرم میں مصنف بے چارہ مانخوا ہوتا ہے“۔^{۴۰}

اس طرح دیکھئے تو ناپ کے حرف کے خلاف خفیف مزاحیہ سے احتجاج کے پردے میں اکبر دراصل اس کثیر بید او اری تہذیب کی شکایت کر رہے ہیں جس میں کثرت اور عجلت کی خاطر معیاروں کو پست کر دیا جاتا ہے۔ جو چیز کہ پہلے فن پارے کا درجہ رکھتی تھی اب سرد اور بے جان طریقوں سے بنتی ہے اور اس میں اغلاط بے شمار ہوتے ہیں۔ انھیں وجوہ سے اکبر کو فوٹو گرافی بھی پسند نہ تھی اور گراموفون بھی، کہ دونوں ہی میں شخص اور اس کے صفات الگ ہو جاتے ہیں۔ اور چھپی ہوئی تصویر تو اور بھی ناپسندیدہ تھی کہ وہ نقل کی نقل ہے۔

ہم کو اپنے ہلیم پر ناز کا ہے کیا محل بے حد ارزش ہو گیا ہے اب تو فوٹو آپ کا آپ کے درشن مصور کے بھی حصے میں نہیں بس لیا جاتا ہے فوٹو ہی سے فوٹو آپ کا”

کیا عجب ہو گئے مجھ سے مرے دمаз جدا دو رو نو میں گلے سے ہوئی آواز جدا^{۴۱}

کچھ ایسا ہی تناو، بلکہ شاید اس سے بدتر، ٹیلیفون کے ساتھ تھا، کہ ٹیلیفون نہ صرف لائنچی ہے، بلکہ چونکہ اس پر بات کرتے وقت مخاطب سامنے ہوتا ہی نہیں، لہذا فون پر انکار

آسان ہوتا ہے۔

امید چشم مرد میں کہاں رہی باقی ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا^{۳۳}
اکبر کی نگاہ میں اخبار بھی ایک طرح کا تہذیبی حملہ تھا۔ برطانوی تجارت اور برطانوی
اطلاعات میں وہ کوئی فرق نہ دیکھتے تھے۔ (یہ فرق ہمیں اب نظر آ رہا ہے جب اس کو قائم ہوئے
ایک صدی گزر چکی)۔ دوسری بات یہ تھی کہ جارحانہ انداز فروشنگی کے باعث اخبار نہ صرف
تجارت کا آکھ کا رہتا، بلکہ غلط اطلاعات کا بھی قاصد تھا۔ اشتہار کی دنیا میں ہر چیز اپنی جگہ پر
بہترین تھی اور ہر چیز کسی اور ضرورت کو راہ دیتی تھی۔ پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اخباروں کا دبدبہ
بہت تھا، لہذا بھولے بھالے ہی نہیں پڑھے لکھے ہندوستانی لوگ بھی اس بات کے مشتاق رہتے تھے
کہ اخبار میں ان کا نام آ جائے۔ اور اگر کوئی تحریر چھپ جائے تو کہنا ہی کیا ہے۔ اخبار کو اس قدر
باعزت بنادینا اکبر کی نگاہ میں قومی و قارکے منافی تھا۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے^{۳۴}

☆☆☆

اپنی گرد سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے
دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈنٹا بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے
چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجئے^{۳۵}

☆☆☆

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم اس کا پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے۔^{۳۶}

☆☆☆

ہوئے طوبیٰ ہے اب نہ مر مگر نہ مون کہڑ ہے اب نظر میں ہوں اگر ہے تو بس بھاہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں ”

☆☆☆

مجھے بھی دیجھے اخبار کا ورق کوئی مگر وہ جس میں دواوں کا اشتہار نہ ہو^{۲۸} آخري شعر خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اپنی معمولہ ذکاوت اور دراکی کے باعث اکبر یہ بات جان گئے تھے کہ اشتہار چھاپنا اخباروں کا اصل کام نہیں۔ انگلستان میں جب اخبار چھپنا شروع ہوئے تو ان میں پارلیمنٹ کی بحثوں کی رواداد کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ تو انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب اور اس کی پیدا کردہ خوانندہ مل مزدوروں کی فوج کثیر کے باعث تھا کہ اخباروں میں جرام، فوجداری مقدمات، انعامات، وغیرہ ”سنمنی خیز“ خبریں بھی شائع ہونے لگیں۔ اشتہار تو اور بھی دیر میں آئے، یعنی اس زمانے میں، جب اسیبلی لائن کا طریقہ پیداوار و صنعت راجح ہوا اور ہر چیز بہت وافر تعداد میں بننے اور بنائی جانے لگی۔ اس طرح اخبار، جو اصلًا سیاسی تعلیم کا وسیلہ تھا، بڑے بنس اور جارحانہ فروشنگ کے میدان کا اہم کھلاڑی بن گیا۔

اخبار کو اشتہار کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے، ایسا لگتا ہے کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں بھی کئی لوگ اس خیال کے حامل تھے۔ اخبار کا انگریزی روپ جس میں وہ ہرفن مولا قسم کا رہنمایا، ہندوستانی تہذیب کے ساتھ کچھ زیادہ ہم آہنگ نہ تھا۔ سرشار کا ”فسانہ آزاد“ ایسا متن نہیں ہے جس میں ہندوستانی تہذیب، خاص کر ہندو مسلم مخلوط تہذیب کی شاء خوانی ہو۔ سرشار کی نظر میں کوئی بات اسی وقت بھی ثابت ہوتی ہے جب انگریز اس کی تصدیق کرے۔ کتاب کے بالکل شروع میں میاں آزاد اور ایک حسین بازاری کی حسب ذیل گفتگو ملاحظہ ہو:

آزاد: آج پروفیسر لاک صاحب زبان پاک سنکرت کی اشرفیت پر

لکھر دینے والے ہیں۔ یہ بزرگوار بڑے مقدس اور عالم یگانہ،
یکتا نے زمانہ، مشہور دیار و امصار ہیں۔

چھمگی جان: لاحول ولا قوۃ، بھی خدا کی قسم کتنے بھوٹے ہو، کتنا
خراب مذاق ہے۔ پروفیسر صاحب کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی۔
ہم اتنے بڑے ہوئے آج تک نام بھی سنا ہو تو قسم لیجئے۔ کیا دنی خاں
سے زیادہ مشہور ہیں؟ ۳۹

ہندوستانی عورت کی دنیا کتنی تنگ اور اس کا دماغ کس قدر چھوٹا اور خرافات سے بھرا
ہوا ہے، اس کو چھوڑ دیئے، اس بات کو دیکھئے کہ سنگرت [یعنی ہندوستانی تہذیب] کی خوبی بس
اتنی، اسی حد تک، اور اسی وقت ہے جب کوئی مغربی [یعنی انگریز] عالم اس کی تصدیق کرے۔
میاں آزاد نمائندہ ہیں نئے انسان کے جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور چھمگی جان [یہاں وہ
محض طوائف نہیں بلکہ پوری ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ ہے] اس قدر الٹی عقل کی ہے کہ
جب کوئی مغربی [انگریز] عالم اس کی خوبیاں بیان بھی کرنا چاہتا ہے تو وہ سنتی نہیں، اپنی ہی گاتی
رہتی ہے۔ یہ تہذیب بے عقل بھی ہے اور زوال آمادہ بھی۔ اسے یقین نہیں کہ کوئی یورپی عالم
اس کے طبلے کے برابر شہرت یافتہ ہو سکتا ہے۔

خیر، تو اب اسی ”فاتحہ آزاد“ میں اخبار کا حال پڑھیں، پھر اکبر کے نقطہ نظر کی بنیاد
 واضح ہو جائے گی۔ میاں آزاد کے ایک دوست بہار کو یہ بات کچھ پسند نہیں آئی ہے کہ اخبار میں
کسی خالی اسماں کے بارے میں اشتہار چھپا ہے کہ لوگ اس کے لئے درخواست دیں:
بہار۔ خدا کا میاب کرے۔ لیکن سنئے تو سہی، یہ تو اخبار ہے۔ اس

میں خلوے عہدہ اور تنخواہ، اور درخواست کا کیا جھگڑا؟ اس میں محابے کا حال، یا جنگ و جدال، علمی اور پلٹیکل قیل و قال چاہیے یا یہ جنجال؟ آزاد: تو قبلہ آپ نے اخبار پڑھا ہی نہیں۔ پیر و مرشد، اخبار تو عطر مجموعہ ہے۔ لڑکوں کا اتا لیق، جوانوں کا ناصح شفیق، بڑھوں کے تجربے کی کسوٹی، رکن رکین سلطنت، تجارت کا دوست، صناعوں کا یار غار، رعایا کا وکیل، جمہور انام کا سفیر، مدبروں کا مشیر۔ کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ، کہیں سو شل امور میں سکرار۔ کہیں اشعار آبدار، کہیں نوش اور اشتہار۔ انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں، اور دیسی اخبار بھی ان کا تتبع کرتے ہیں۔ ۵۰

ظاہر ہے کہ یہاں بھی میاں آزاد نے انسان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کے لئے اخبار صرف اطلاعاتی کاغذ نہیں، تعلیم کا بدل اور ذہنوں پر قبضہ قائم کرنے کا طاقتورو سیلہ ہے۔ میاں آزاد کو اخبار کی ہر فن مولائی طریقہ فروشنگی، ذاتی معاملات کو بر سر عام زیر بحث لانے کی ادا، یہ سب باتیں بھلی لگتی ہیں، اور اکبر کو انھیں کی بناء پر اخبار سے شکایت ہے۔ اخبار ایک مادہ پرستانہ اور دنیادارانہ ہے۔ اکبر کی نظر میں اس کا اولین مقصد علم یا اطلاع کا فروع نہیں، تجارت اور انگریزی حکومت کے انتظامی اور سیاسی مفادات و مقاصد کا فروع ہے۔ پدم سنگھ شرما کے نام ایک خط میں اکبر نے اخبار کو ان اشیاء کی ضمیں میں رکھا تھا جو ان کے خیال میں تفریق اور چشمک کو پھلنے پھونے کا موقع دیتی ہیں:

ایک ایک بادہ خود پرستی میں محو و سرشار ہے۔ کوئل اور کمیٹی اور اخبار

موجود ہے۔ پھر آپس میں محبت بڑھانے، بھائی چارہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔^{۵۱}

برطانوی حکومت کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مقاصد کو اخبار سے بھی زیادہ بہتر طور پر کوئی پورا کرتا تھا تو وہ ریل گاڑی تھی۔ اکبر نے مال گاڑی، ریل، اور انجن کا تذکرہ بار بار کیا ہے۔ مال گاڑی پہ بھروسہ ہے جنہیں اے اکبر ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا^{۵۲}

تہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن پیروں پہ نہ وہ طائر صحراء پہ نہ وہ جو بن جنگل کے جو تھے سامیں وہ ریل کے ہیں پائیں الی کی جگہ سگنل قمری کی جگہ انجن^{۵۳} اکبر کے ماحولیاتی سروکار اور ترددات اپنے زمانے سے آگے تو ہیں ہی، اپنی شدت میں وہ ان کے سماجی اور سیاسی ترددات سے کم نہیں۔ مومن کے شاگرد میر حسین تسلیم دہلوی کا یہ شعر سب کا سنا ہوا ہو گا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی^{۵۴}
اکبر کی پیروڈی انتہائی پر لطف لیکن اندر ہی اندر تلنخی سے بھری ہوئی بھی ہے۔
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی^{۵۵}
ریلوے انجن نے جدید انسان کو رعوت اور غیر ضروری خود اعتمادی سے بھر دیا ہے۔
نئے نہیں ہیں شخ نئی روشنی کی بات انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ، بیجے^{۵۶}

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز بھینس کے آگے میں ہے کیا چیز^{۵۷}

اکبر نے ریلوے انجن کا ذکر بڑی تلخی اور طنز اور کثرت سے کیا ہے۔ ریل کے فوائد سے تو سمجھی آگاہ تھے، لیکن ریل کے سماجی اور تہذیبی تقصیانات پر اکبر کی نظر جس طرح پڑی ہے اس کی مثال مل نہیں سکتی۔ انھیں پورا احساس تھا کہ نوآبادیوں کے اقتصادی استحصال کے آئے، اور نظام حکومت میں ایک طاقتور سیاسی بیان کے طور پر ریل گاڑی ایک نہایت مؤثر ایجاد ہے۔

اس کا پیشنا ہے اور اس کے ہیں بھپارے یورپ نے ایشیا کو انجن پر رکھ لیا ہے ۵۸ میں نے اس مضمون میں اکبر کی زبان اور ان کے اسلوب کے حسن پر اظہار خیال کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن یہاں میں ”انجن پر رکھ لیا ہے“ کے زور اور بلاغت کی داد دے بغیر نہیں رہ سکتا ۵۹ تلوار پر رکھ لینا، تلوار کی باڑھ پر رکھ لینا، گولیوں کی باڑھ پر رکھ لینا، وغیرہ محاورے تو ہیں ہی، انگریزی کا محاورہ To put to the sword بھی ذہن میں آتا ہے۔ پھر ”پر رکھ لیا ہے“ میں شکار مار کر گھوڑے کی پشت یا زین پر رکھ لینے کا پیکر صاف نظر آتا ہے۔ ”پر رکھ لیا“ میں ملازم رکھنے، یا ”ڈیوٹی پر لگانے“ کا مفہوم بھی ہے۔ اور بھی نکات ہیں، لیکن بات یہاں ختم کرتا ہوں کہ اکبر نے صرف ہندوستان اور برطانیہ کا ذکر نہیں کیا ہے، ایشیا اور یورپ کی بات کی ہے۔ مزید کچھ شعر دیکھئے۔

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت کبوتر اڑ گئے انجن کی پیس سے ۶۰

کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نوجوان خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے ۶۱
اکبر الہ آبادی اور اقبال ہمارے اویں اور سب سے بڑے پس نوآبادیاتی ادیب ہیں۔
دونوں کو برطانوی طرز فلکرو حیات کی اچھی واقفیت تھی اور دونوں ہی کو مغرب کچھ مرعوب نہ

کر سکا۔ اس بات کو منظر رکھیں کہ بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے اوآخر میں ہمارے دانشور سب کے سب مغرب کی ذہنی غلامی میں بنتا تھا، تو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔^{۶۴} مغرب کے بارے میں اقبال کی معلومات براہ راست تھیں اور مغرب سے ان کے اختلاف کی بنیادیں فلسفیانہ اور دانشورانہ تھیں۔ عبدالماجد دریابادی کے نام اکبر کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبر بھی مغربی افکار سے بیگانہ نہیں تھے۔^{۶۵} لیکن ان کے سروکار اور ترددات زیادہ تر عملی دنیا کے معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ اکبر کو جدید ہندوستان کے سماجی، سیاسی، اور مذہبی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اقبال کا خیال تھا کہ انہوں نے ہندوستان، اور خاص کر ہندوستانی مسلمان کے مسائل کے ایسے حل ڈھونڈ لئے ہیں جو عملی بھی ہیں اور فلسفیانہ بھی۔ لیکن؟ کبر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کچھ زیادہ اصلاح حال ممکن نہیں۔ انہوں نے ۲ نومبر ۱۹۱۲ کے مکتوب میں پدم سنگھ شرما کو لکھا:

زمانے کا رنگ آپ دیکھ رہے ہیں۔ جھوٹی عزت اور نقصان رسان
لذتوں کا شوق طبیعتوں پر غالب ہے۔ نام ہے ملکی ترقی کا لیکن کوشش ان
باتوں کی ہو رہی ہے جن سے سوسائٹی ملکہ ملکہ ہو جائے۔^{۶۶}

اسی طرح، اپنی شاعری کے بارے میں ۱۹۱۷ کے ایک خط میں اکبر نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:

یہ نظمیں انقلاب روکنے کے لئے نہیں ہیں، یادگار انقلاب ہیں۔ حصہ دوم
میں یہ شعر پائیے گا۔

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب یہ اسے معلوم ہے ملتی نہیں آئی ہوئی^{۶۷}
خیال رہے کہ ”آئی“ کے معنی ”موت“ بھی ہیں۔ اس لفظ کا استعمال اشارہ کرتا ہے کہ

اکبر کو خوب معلوم تھا کہ نیا سماج اور نیا نظام تو بہر حال آکر رہے گا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ پرانی تہذیبی اقدار کہاں تک ضائع ہونے سے محفوظ رکھی جاسکتی ہیں۔ وہ خود کو ایسی فوج کے پچھلے دستے کا سپاہی سمجھتے تھے جس کے پاؤں تو اکھڑی چکے تھے، اور وہ بس موخرہ صفوں میں کھڑے نبرداز مانی کر رہے تھے۔ اسی باعث ان کی آواز میں تختی کے ساتھ ساتھ گہرا درد بھی ہے۔ مغربی اقدار، مغربی طرز حکومت، اور پرانے اقدار کو ترک کر کے نئے کو اپنانے پر جو اصرار ان کے زمانے میں ہو رہا تھا، اکبر نے بے سوچ سمجھے اور محض قدامت پرستانہ ضد کی بناء پر ان کی مخالفت نہ کی تھی۔ بے شک ان کی تمنا تھی کہ ملک آگے بڑھے، جدید بنے، لیکن انھیں اس کی قیمت کے طور پر ہندو مسلم نفاق، اردو ہندی جھگٹرا، عزبت نفس کا زیاد، اقدار کو کہنے قرار دیا جانا، مذہب اور تاریخ کا مسخ کیا جانا، جیسی باتیں منظور نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ آج ہم میں سے کچھ لوگ خیال کریں کہ اکبر نے غرورت سے زیادہ شدید رد عمل ظاہر کیا، یا پھر وہ معاملے کو کچھ سادہ اور سہل بنایا کر پیش کر رہے تھے۔ لیکن اکبر کے اور ان کے موقف کی بنیادی درستی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اخبار، یاریل گاڑی، کے خلاف نہ تھے، نہ وہ ان چیزوں کے خلاف تھے جنہیں انگریزی حکومت ”عوامی بہبود“ کے کام کہتی تھی۔ انگریزی عہد میں محکمہ تعلیم کو public Instruction کا محکمہ کہتے تھے۔ عمارتوں کی تعمیر کے محکمے کو اب بھی Public Works کا محکمہ کہا جاتا ہے۔ ”پبلک“ کے نام پر یہ محکمے ہمارے تہذیبی درشت کا استحصال کر رہے تھے اور انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی برتری کو قائم کرنے، مستحکم کرنے، اور پھیلانے میں معاون تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعد کی تاریخ نے اکبر کو بڑی حد تک صحیح ثابت کیا ہے۔

صدق الرحمن قد والی ان معدودے چند اردو نقادوں میں ہیں، جنہوں نے اکبر کی

ظرافت کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر خود پر ہستے ہیں اور اس بھی کی تھی میں احساس شکست بھی ہے، لیکن اس کی تھی میں کہیں یہ علم بھی پہاڑ ہے کہ دشمن، جو بظاہر کامیاب ہے، بالآخر اس کو ہم سے بھی بدتر شکست نصیب ہوگی۔^{۶۶} میرا خیال ہے یہ ذرا زیادتی کی بات ہے کہ اکبر کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لئے ہم انھیں مستقبل بنی کی بھی صفت سے متصف دیکھیں جو درحقیقت ان میں تھی نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اکبر خاصے مضبوط دل و دماغ کے شخص تھے، وہ کوئی چھوٹی مولیٰ قسم کی چیز نہ تھے۔ شکست خور دگی ان کے کلام میں ہو یانہ ہو، لیکن تھڑا پن اور گھبراہٹ کہیں نہ تھی۔

رالف رسل کا بھی خیال ہے کہ اکبر کی شاعری اور شخصیت میں کچھ اسی قسم کی عقیلیت پسندی اور سرد ہوشمندی تھی جیسی وسط بیسویں صدی کے بعض مفکروں میں نظر آتی ہے، اور جو خود شاید رسل صاحب کی فطرت کا خاصہ ہے۔ شاید اسی لئے رسل نے لکھا ہے کہ ”اکبر ان شعراء میں ہیں جو نئی اور پرانی روشنی کی آویزش کو دیکھتے ہیں لیکن وہ کسی ایک کی مکمل اور بے روک ٹوک جمایت نہیں کرتے۔“^{۶۷} اس کے برخلاف، رسل اور خورشید الاسلام کی اس بات میں زیادہ وزن ہے کہ ”اکبر ہرگز کاٹھ کی طرح کڑا اور تخلیل سے عاری اور ضدی قدامت پرست نہیں ہیں جیسا کہ بعض نے انھیں بیان کیا ہے.... اصلًا اور بنیادی طور پر وہ ایک ایسے شخص ہیں جسے تبدیلی کا احساس شدت سے ہے اور جو تبدیلی کے نامقاومت پذیر ہونے کا بھی احساس رکھتا ہے۔“^{۶۸}

جو تصور اکبر کی شاعری آخر کار ہم پر چھوڑ جاتی ہے وہ ایسے شخص اور شاعر کا ہے جسے معاملات کی سیاسی تہوں اور معنویتیوں کا گہرا اور فوری احساس تھا۔ ایسا شاعر جس نے غصب کی حس مزاح اور طباعی قدرت پائی تھی اور جس نے اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مسائل پر ناقابل یقین حد تک انسانی حسن اور نیت نئے مضمایں کی زرخیزی کے ساتھ لکھا۔ اگر کسی کو اکبر کے پیغام سے محبت نہ ہو (اور آج ایسے بہت سے ہیں) تو بھی وہ اکبر کی شدید حب الوطنی، اور انگریزوں کے خلاف ان کے دل میں اتنی ہی شدید نفرت کا احساس کرے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندوستانیوں سے جب انگریزوں نے سماجی سطح پر میل جوں شروع کیا تو انہوں نے ہندوستانیوں کو مغزور، نازک مزاج، اور نفاست پر خاص زور دینے والا، بلکہ انگریزوں کو بے نگاہ تحریر دیکھنے والا قرار دیا۔ انیسویں صدی کی آخری تہائی تک یہ سب بدل جاتا ہے۔ اب زیادہ تر ہندوستانی، علی الخصوص دانشور ہندوستانی، اس رائے کے ہو جاتے ہیں کہ ہندوستانی کے مقابلے میں یورپیں، خاص کر انگریز، کی اخلاقی اور فنی برتری پر جو بھی کہا جائے کم ہو گا۔ اکبر اور اقبال یہاں ممتاز نظر آتے ہیں، اور انگریز کو اکبر جتنا پسند کرتے تھے اس حد تک شاید اقبال بھی انھیں ناپسند نہ کرتے ہوں گے۔

اکبر نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر کئی دلچسپ طنزیہ شعر لکھے ہیں۔ سب سے مشہور ترین حسب ذیل دو شعر کی لظم ہے جس میں حافظ کا ایک مصرع بڑی خوبی سے چسپاں کیا گیا ہے۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست فکر ہر کس بقدر ہمت اوست^{۱۹}

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اکبر نے ایک عشقیہ شعر کی پیروڈی کر کے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ یہاں وہ حافظ کے مشہور تر عشقیہ شعر کی دنیا سے جدید سائنسی فکر پر اظہار خیال کا نکتہ ڈھونڈ نکلتے ہیں۔ حافظ کا شعر ہے۔

تو و طوبی و ما و قامت یار فکر ہر کس بقدر ہمت اوست^{۲۰}

خبر، پیروڈی، اور دوسروں کے مقولوں کو اپنے مطلب کا بنا کر برنا تو اکبر کے خاص فنوں میں سے ایک فن تھا۔ اور جگہ انہوں نے طنز کی وہ چھپریاں چلائی ہیں کہ تو بہ ہی بھلی۔

قر الدین احمد بدالیوی لکھتے ہیں کہ ۲۸ جنوری ۱۹۲۱ کو ایک گفتگو میں اکبر نے کہا:

اگر ڈارون کی یہ تھیوری درست ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو اس منزل تھدن پر اہل یورپ کو انسانیت کے بہت سے اعلیٰ محسن کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں۔ اس پر افسوس کرتا ہوں۔

یا الہی یہ کیسے بذر ہیں ارتقاء پر بھی آدمی نہ ہوئے۔
 اس طرح اکبر کی شاعری میں تہذیبی تاریخ کا چرخ پورا ہوتا ہے: بجائے اس کے کہ انگریز لوگ ہمیں حقارت سے دیکھیں، ہم انھیں حقارت اور مایوسی سے دیکھتے ہیں۔ اکبر کو اپنے شاعرانہ مرتبے کا پورا احساس تھا۔ بھلے ہی آج کے لوگ انھیں جو کر، یا قدامت پرست بھائی قسم کی چیز سمجھنے لگے ہوں، لیکن خود اکبر اس بات پر پوری طرح آگاہ تھے کہ ان کے مقاصد جلیل و سنجیدہ تھے اور وہ الفاظ کے بہت بڑے پارکھ اور بہت بڑے فنکار تھے۔

بہت سے اردو کے نقاد مصر ہیں کہ اکبر اللہ آبادی ترقی اور روشن فکری کے اندھے مخالف تھے۔ امید ہے کہ موجودہ تحریر نے اس رائے کے جھوٹ کو ثابت کرنے میں کچھ خدمت انجام دی ہوگی۔ لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ اکبر میں عزتِ نفس کا پاس اور قومی افتخار کا احساس ان کے نکتہ چینوں سے زیادہ تھا۔ اور شاعر کی حیثیت سے انھیں جزئیات میں آنکھ اور انہتائی تیز کاٹ رکھنے والی طبائی و دلیعت ہوئی تھیں۔^{۲۷} پھر انھیں اردو شاعری کے آہنگوں کا غیر معمولی احساس تھا، اور ان کی تکنیکی مہارت ایسی تھی کہ اقبال کے سوا اس کی نظری نہیں ملتی۔ معاصر دنیا پر رائے زنی کرنے والے کی حیثیت سے ان کے کلام میں وہ دانش و رانہ تو اہنائی، وہ برفیلا جدبہ تحقیر، اور وہ بھڑکتا ہوا غصہ ہے جو اٹھارویں صدی کے بعد ہمارے یہاں ناپید تھا۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی اکبر کا دل درد سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی تاریخ اور تہذیب کا ضیاع و زیان ان پر بہت شاق تھا، شاید خاص کراس وجہ سے، کہ وہ جانتے تھے کہ میں خود بھی کسی نہ کسی طرح سے ان طاقتون کا حصہ ہوں جو میرے درٹے کو لئے جا رہی ہیں۔ شاید ان کا یہ شعر ان کے لوح مزار کے لئے مناسب ہوتا۔

جو گلذرو گے ادھر سے میرا جڑا گاؤں دیکھو گے شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورابار کے^{۲۸}

حوالشی

- ۱ ملاحظہ ہو: رقعت اکبر مرتبہ ساحل احمد، اردو رائٹرز گلڈ، ال آباد، ۷، ۱۹۹۷، ص ۱۸۔ اکبر کے خطوں کا یہ مجموعہ پہلی بار لاہور سے محمد نصیر ہمایوں نے شیخ عبدالقدار کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ ساحل احمد نے اب اسے مفصل حوالشی اور کچھ اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔
- ۲ مکتوب علامہ اقبال مورخ ۷ اردو سبب، ۱۹۱۳، بنام اکبرالہ آبادی۔ مشمولہ "کلیات مکاتیب اقبال" جلد اول مرتبہ سید نظر حسین برلنی، دہلی اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱، ص ۳۲۰۔
- ۳ کلیات اکبر، جلد سوم، اسرار کریمی پریس، ال آباد، ۱۹۳۰، ص ۱۵۳۔
- ۴ آب حیات از محمد حسین آزاد، کلکتہ، ۷، ۱۹۶۱، ص ۱۸۔
- ۵ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، نذری احمد اینڈ سنز، علی گڑھ، ۱۹۳۲، ص ۸۷۔
- ۶ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۱۵۷۔
- ۷ کلیات اکبر، جلد اول، ال آباد، اسرار کریمی پریس، ص ۲۰۷۔
- ۸ اکبر کے یہاں مذہبی طور طریق میں بھی تضاد کو انگیز کرنے کی کچھ ایسی ہی ادا پائی جاتی ہے۔ وہ خود راخ العقیدہ سنی تھے، لیکن ان کی دوسری بیوی، جن کی محبت نے ان سے پہلی بیوی چھڑا دی، شیعہ تمیس۔ لیکن عمر کے ساتھ اکبر کے مزاج میں تشیع کے خلاف تعصب بھی بڑھتا گیا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اکبر نے عشرت حسین کی شادی ایک شیخزادے کی بیٹی سے کی۔ شیخ صاحب اصلانی سنی تھے، لیکن شیعہ بیوی کر کے خود بھی شیعہ ہو گئے تھے۔ اکبر کے مذہبی معاملات کا تیراپہلو یہ ہے کہ ایک زمانے میں مشہور ہوا کہ عشرت حسین نے شیعیت اختیار کر لی ہے۔ اکبر کو اس بات پر بڑا تردود ہوا اور انہوں نے سر شاہ محمد سلیمان سے کہا کہ عشرت حسین کو تشیع کی طرف مائل ہونے سے روکئے۔ لیکن شاہ صاحب نے گول مول سا جواب دیا کہ آپ یہ معاملہ عشرت حسین کی موجودگی میں اٹھائیں تو میں ضرور کہوں گا۔ اکبر چاہتے تھے کہ عشرت حسین کے ایک بیٹے محمد عقیل کی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہو۔ لیکن یہ بدل شاید منہ ہے چڑھی نہیں۔ ملاحظہ ہو، بزم اکبر از قمر الدین احمد بدایوی، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۳۰، ص ۲۵، ۲۷، ۴۲۱، ۴۲۲، اور رقعت اکبر، ص ۲۲، ۲۵۔
- ۹ کلیات اکبر، جلد دوم، لکھنؤ، دہلی پریس، ۱۹۳۱، ص ۳۰۔
- ۱۰ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۱۶۱۔
- ۱۱ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۱۔

- ۱۲ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۱۹۹۔
- ۱۳ ملا حظہ ہوا سلوب احمد انصاری کی مرتب کردہ کتاب Sir Syed Ahmad Khan (Delhi, Adam Publications, 2001) میں ڈیوڈ لیلی ولڈ A Centenary Tribute (Delhi, Adam Publications, 2001) کا مضمون بعنوان Macaulay's Curse: Sir Syed and David Lelyveld (David Lelyveld)
- ۱۴ - دیے یہ بات اپنی جگہ تھی ہے کہ سید محمد کو انگریزی زبان پر اس درجہ قدرت تھی کہ انگریز بھی رشک کرتے تھے۔
- ۱۵ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۱۸۵۔
- ۱۶ یہ شعر قر الدین احمد بدایوی کی بزم اکبر کے صفحہ ۱۵۸ پر درج ہے۔ اکبر نے اسے کلیات میں نہ شامل کیا۔ وجہ ظاہر ہے۔ لیکن یہاں کے مشہور ترین اشعار میں ہے۔
- ۱۷ بزم اکبر، ص ۶۳۔ یہ شعر بھی کلیات میں نہیں ہے۔
- ۱۸ گاندھی نامہ، ص ۲۵۔ شعر کامن پچھے غلط چھپا ہے۔ میں نے قیاسی صحیح کی ہے۔ اس شعر کے حوالے سے مولانا محمد علی کا ذکر بزم اکبر کے صفحہ ۲۵۲ تا ۲۵۳ پر ملا حظہ ہو۔
- ۱۹ بزم اکبر، ص ۱۳۶، ۱۶۲ تا ۱۶۳، اور حاشیہ، ص ۱۶۳۔
- ۲۰ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۶۳۔
- ۲۱ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۶۸۔
- ۲۲ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۱۵۔
- ۲۳ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۵۲۔
- ۲۴ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۹۲۔
- ۲۵ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۵۵۔
- ۲۶ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۸۲۔
- ۲۷ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۱۹۔
- ۲۸ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۱۲۔
- ۲۹ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۸۵۔
- ۳۰ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۱۳۔

۳۱ غالب کے خطوط، مرتبہ طیقِ انجم، جلد دوم، غالب انسٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۸۵، ص ۵۲۳۔

۳۲ بزمِ اکبر، ص ۱۳۲۔ ۱۳۲۔ اکبر کا شعر کلیات، جلد سوم، ص ۳۲ پر ہے، اور اپنا جو مصرع انہوں نے پڑھا وہ کلیات، جلد سوم، ص ۱۳۰ پر دیکھا جاسکتا ہے۔

۳۳ ابن بطوطة کا بیان ہے کہ ۱۳۲۷ میں جب محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنے درے دار الخلافے کے طور پر آباد کیا تو اس کا حکم ہوا کہ گنجکا کا پانی میرے لئے ہر روز شامی ہند سے لا یا جائے۔ یہ چالیس دن کی مسافت تھی۔ ملاحظہ ہو:

Ibn-e-Battua, *The Rehla: Translated by Agha Mehdi Husain,*

Baroda, The Oriental Institute, 1953, p.4

۳۴ ابو الفضل لکھتا ہے: ”قیام ہو یا سفر، اعلیٰ حضرت صرف گنجکا کا پانی پیتے ہیں ... کھانا پکانے کے لئے جنم اور چتاب کا پانی، تھوڑے سے بارش کے پانی اور گنجکا کے پانی میں ملا کر استعمال کیا جاتا ہے۔“ ملاحظہ ہو: آئین اکبری، جلد اول، مرتبہ ایج - بلاک مان، ص ۵۱۔ یہ اقتباس میں نے شیریں موسوی کی کتاب Episodes in the Life of Akbar: Contemporary Records and مطبوعہ Reminiscences نیشنل بک ٹرست دہلی، ۱۹۹۸، ص ۱۰۰ سے حاصل کیا ہے۔ اس حوالے اور ابن بطوطة کے بھی حوالے کے لئے میں پروفیسر نعیم الرحمن فاروقی (الآباد یونورسٹی) کا منون ہوں۔

۳۵ ملاحظہ ہو: Environment and Pollution in Mughal India از ایم۔ افضل خاں، مطبوعہ Islamic Culture, Vol. LXXVI, January, 2002، اس حوالے کے لئے بھی میں نعیم الرحمن فاروقی کا شکر گذار ہوں۔ pp. 104-105.

۳۶ (۱) مکتوب مورخ فروری ۱۸۶۰ بنا م حکیم غلام نجف خاں، (۲) مکتوب مورخ فروری ۱۸۶۰ بنا میر مہدی مجردح۔ ملاحظہ ہو: غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ طیقِ انجم، ص ۱۳۰ اور ۵۱۔

۳۷ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۳۹۔

۳۸ مکتوب مورخ ۱۸ اگست، ۱۸۵۸۔ ملاحظہ ہو: غالب کے خطوط، جلد اول، مرتبہ طیقِ انجم، ص ۲۹۲۔

۳۹ بنا میر مہدی مجردح، غالب کے خطوط، جلد دوم، مرتبہ طیقِ انجم، ص ۵۲۱۔

۴۰ مکتوب مورخ ۸ مئی ۱۸۶۲۔ ملاحظہ ہو: غالب کے خطوط، جلد چہارم، مرتبہ طیقِ انجم، ص ۱۵۱۔ یہ دعاں میں رہے کہ پریس میں ملازم خطا طوں کو غالب نے مسلسل ”کالپنگار“ کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ انہیں ”کاتب“ نہ قرار دیتے تھے، چہ جائے کہ اس قسم کے فن کار اور خطاط جیسے خود ان کے کاتب نواب ناصر الدین خاں تھے۔ ملحوظ ہے کہ قبل جدید ہندوستان میں خطاطی کو فن شریف قرار دیتے تھے اور خود بہادر شاہ ظفر بے حد عمدہ خطاط تھے۔

- ۳۱ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۲۰۔
- ۳۲ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۱۰۔
- ۳۳ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۷۔
- ۳۴ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۶۲۔
- ۳۵ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۵۳۔
- ۳۶ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۶۸۔
- ۳۷ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۲۶۔
- ۳۸ انتخاب اکبرالہ آبادی، صدیق الرحمن قدوالی، مکتبہ جامعہ، ۱۹۸۲، ص ۱۵۳۔
- ۳۹ فسانہ آزاد، رتن ناٹھر شار، جلد اول، ترقی اردو کنسل دہلی، ص ۱۵ [اول اشاعت ۱۸۸۰]۔
- ۴۰ فسانہ آزاد، رتن ناٹھر شار، جلد اول، ص ۱۶۳۔
- ۴۱ مکتوب مورخہ ۹ فروری ۱۹۱۳۔ ملاحظہ ہو: رقصات اکبر، مرتبہ ساحل احمد، ص ۱۲۶۔
- ۴۲ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۸۔
- ۴۳ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۵۶۔
- ۴۴ اس شعر کے مصنف کے بارے میں اکثر بحث رہی ہے۔ بہت سے لوگ اسے مومن کا کلام سمجھتے ہیں، لیکن مومن کے کلیات میں اس کا پتہ نہیں۔ عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ پیش مصرع میر حسین تکمین کا کہا ہوا ہے، لیکن وہ اس پر مصرع نہ لگائے تو تھک ہار کر مومن کے پاس آئے۔ مومن نے فی البدیہ مصرع لگا دیا اور شعر زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ ملاحظہ ہو: حیات مومن، عرش گیاوی، ص ۳۰، اول مطبوعہ ۱۹۲۸/۱۹۲۹۔ میرے سامنے اس کا فوٹو ایڈیشن ہے جو فرمان فتح پوری نے ”نگار پاکستان“ کے ایک نمبر کے طور پر اگست ۱۹۹۰ میں شائع کیا تھا۔
- ۴۵ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۵۱۔
- ۴۶ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۲۵۲۔
- ۴۷ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۳۲۲۔
- ۴۸ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۱۰۳۔
- ۴۹ آل احمد سرور نے اکبر کی فنی چاک دتی اور زبان کے مناعانہ استعمال کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اور کچھ نہیں تو یہی خوبیاں اکبر کے کلام کے پڑھے جانے کا جواز ہیں۔ ملاحظہ ہواں کا مضمون: اکبر کی معنویت، مشمولہ کچھ خطبے کچھ مقالے، علی گڑھ، ۱۹۹۶، ص ۷۰، ۷۱، ۷۲۔

- ۶۰ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۳۶۔
- ۶۱ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۹۸۔
- ۶۲ اقبال کی اسرارِ خودی اور موزی بے خودی کا انگریزی ترجمہ (از نگنس) انگلستان میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس پر اکبر نے شیخ عبدال قادر کو لکھا (۱۲۱ اپریل، ۱۹۲۱) :
- میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ در بارلنڈن میں وہ مقبول ہیں۔
 طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا سودا نہیں ہے مجھ کو حر یغوش کی واہ کا
 ملاحظہ ہو: رقعتات اکبر، ص ص ۱۱۵، ۱۱۶۔ اکبر کا شعر مجھے کلیات میں نہ ملا۔
- ۶۳ رقعتات اکبر، ص ص ۱۳۲، ۱۹۰۔
- ۶۴ رقعتات اکبر، ص ص ۱۱۹۔
- ۶۵ رقعتات اکبر، ص ص ۳۶، ۳۷۔ شعر کے لئے دیکھئے، کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۸۳۔
- ۶۶ ملاحظہ ہو: Poet Who Laughed in Pain صدیق الرحمن قدوالی، مضمون مشمول Of Clowns and Gods, Brahmans and Babus, Ed., Christine Oesterheld and C.P. Zoller, New Delhi, Manohar, 1999, p.p.83-84
- ۶۷ ملاحظہ ہو: Hidden in the Lute، رالف رسن، نئی دہلی، ۱۹۹۵، ص ۲۰۰۔
- ۶۸ ملاحظہ ہو: The Satirical Verse of Akbar Ilahabadi از رالف رسن اور خورشید الاسلام مضمون The Pursuit of Urdu Literature, A Select History, London, Zed Books, 1992, p.175
- ۶۹ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ص ۱۳۰، ۱۳۱۔
- ۷۰ دیوان حافظ، مطبوعہ تہران، شرکت نسبی کانون کتاب، ۱۳۲۸ = [۱۹۳۹]، ص ۲۷۔
- ۷۱ بزم اکبر، ص ۱۶۵۔
- ۷۲ بزم اکبر، ص ص ۲۱۷-۲۱۸۔
- ۷۳ کلیات اکبر، جلد دوم، ص ۳۸۔

